دورۂ ترجمۂ قرآن — ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۴۰ تا ۴۶

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا
بِعَہْدِیْٓ اُوْفِ بِعَہْدِکُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍ ۢ بِہٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ
ثَمَنًا قَلِیْلًا ۡ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا
الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ
الرّٰکِعِیْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْکِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ۭ وَاِنَّھَا
لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ
اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾

اب یہاں سے بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہو رہا ہے۔ یہ خطاب پانچویں رکوع سے دسویں رکوع تک مسلسل دس رکوعات پر محیط ہے۔ البتہ ان میں ایک تقسیم ہے۔ پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے' اور جب کسی گروہ کو دعوت دی جاتی ہے تو تشویق و ترغیب' دلجوئی اور نرمی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے' جو دعوت کے اجزاءِ لاینفک ہیں۔ اس انداز کے بغیر دعوت مؤثر نہیں ہوتی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ سات آیات (پانچواں رکوع) ان دس رکوعوں کے لیے بمنزلہ فاتحہ ہیں۔ بنی اسرائیل کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی تھی' جن کو یہاں دعوت دی جارہی ہے۔ وہ بھی مسلمان ہی تھے' لیکن محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے ماننے والے تھے' شریعت اُن کے پاس تھی' بڑے بڑے علماء اُن میں تھے' علم کا چرچا اُن میں تھا۔ غرضیکہ سب کچھ تھا۔ یہاں ان کو دعوت دی جارہی ہے۔ اس سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آج مسلمانوں میں' جو اپنی حقیقت کو بھول گئے ہیں' اپنے فرضِ منصبی سے غافل ہو گئے ہیں اور دنیا کی دیگر قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں' اگر کوئی ایک داعی گروہ کھڑا ہو تو ظاہر بات ہے سب سے پہلے اُسے اسی اُمت کو دعوت دینی ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا تو اسلام کو اِسی اُمت کے حوالے سے پہچانے گی (Physician heals thyself)۔ پہلے یہ خود ٹھیک ہو اور صحیح اسلام کا نمونہ پیش کرے تو دنیا کو دعوت دے سکے گی کہ آؤ دیکھو یہ ہے اسلام! چنانچہ ان کو دعوت دینے کا جو اسلوب ہونا چاہیے وہ اس اسلوب کا عکس ہوگا جو اِن سات آیات میں ہمارے سامنے آئے گا۔

آیت ۴۰ ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا''

''بنی اسرائیل'' کی ترکیب کو سمجھ لیجیے کہ یہ مرکب اضافی ہے۔ ''اسر'' کا معنی ہے بندہ یا غلام۔ اسی سے ''اسیر'' بنا ہے جو کسی کا قیدی ہوتا ہے۔ اور لفظ ''ئیل'' عبرانی میں اللہ کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کا ترجمہ ہوگا ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا غلام' اللہ کی اطاعت کے قلادے کے اندر بندھا ہوا۔ ''اسرائیل'' لقب ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے اور ان سے جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل ہے۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور انہیں تورات دی گئی۔ پھر یہ ایک بہت بڑی اُمت بنے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت تک ان پر عروج و زوال کے چار ادوار آچکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں ہوئیں اور انہیں عروج نصیب ہوا' جبکہ دو مرتبہ دنیا پرستی' شہوت پرستی اور اللہ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دینے کی سزا میں ان پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا۔ اُس وقت جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اپنے اس تیسرے زوال کے دور میں تھے۔ حال یہ تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ان کا ''معبدِ ثانی'' (Second Temple) بھی منہدم کیا جا چکا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو ہیکل سلیمانی بنایا تھا' جس کو یہ ''معبد اوّل'' (First Temple) کہتے ہیں' اسے بخت نصر (Nebukadnezar) نے حضرت مسیح سے بھی چھ سو سال پہلے گرا دیا تھا۔ اسے انہوں نے

دوبارہ تعمیر کیا تھا جو ''معبدِ ثانی'' کہلاتا تھا۔ لیکن ۷۰ عیسوی میں محمد عربی ﷺ کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے رومیوں نے حملہ کر کے یروشلم کو تباہ و برباد کر دیا' یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور جو ''معبدِ ثانی'' انہوں نے تعمیر کیا تھا اُسے بھی مسمار کر دیا' جو اب تک گرا پڑا ہے' صرف ایک دیوارِ گریہ (Veiling Wall) باقی ہے جس کے پاس جا کر یہودی ماتم اور گریہ وزاری کر لیتے ہیں' اور اب وہ اسے سہ بارہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے ''معبدِ ثالث'' (Third Temple) کے نقشے بن چکے ہیں' اس کا بلیو پرنٹ تیار ہو چکا ہے۔ بہرحال جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت یہ بہت ہی پستی میں تھے۔ اس وقت ان سے فرمایا گیا:

''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا تھا۔'' وہ انعام کیا ہے؟ میں نے تم کو اپنی کتاب دی' نبوت سے سرفراز فرمایا' اپنی شریعت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہارے اندر داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسے بادشاہ اٹھائے' جو بادشاہ بھی تھے' نبی بھی تھے۔

﴿وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ﴾ ''اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔''

بنی اسرائیل سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفرِ استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸۔۱۹ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے یہ الفاظ فرمائے:

''میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔''

یہ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو بتایا جا رہا تھا کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) آئیں گے اور تمہیں ان کی نبوت کو تسلیم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ یہاں فرمایا کہ تم میرا عہد پورا کرو' میرے اس نبیؐ کو تسلیم کرو' اُسؐ پر ایمان لاؤ' اس کی صدا پر لبیک کہو تو میرے انعام و اکرام مزید بڑھتے چلے جائیں گے۔

﴿وَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝﴾ ''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

آیت ۴۱ ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کتاب

پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے"

ان الفاظ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان لاؤ اس قرآن پر جو تصدیق کرتا ہے تورات کی اور انجیل کی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدة: ٤٤) "ہم نے نازل کی تورات جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔" ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدة: ٤٦) "اور ہم نے اُس (عیسیٰ علیہ السلام) کو دی انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔" اور دوسرے یہ کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ اُن پیشین گوئیوں کے مصداق بن کر آئے ہیں جو تورات میں تھیں۔ ورنہ وہ پیشین گوئیاں جھوٹی ثابت ہوتیں۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ "اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔"

یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں اوّل مت ہو۔ تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ تم تو آخری نبی ﷺ کے انتظار میں تھے اور اُن کے حوالے سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی آخر الزماں ﷺ کے واسطے سے ہماری مدد فرما اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرما۔ (یہ مضمون آگے چل کر اسی سورۃ البقرۃ ہی میں آئے گا۔) لیکن اب تم ہی اس کے اوّلین منکر ہو گئے ہو اور تم ہی اس کے سب سے بڑھ کر دشمن ہو گئے ہو۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ "اور میری آیات کے عوض حقیر سی قیمت قبول نہ کرو۔"

یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں اور تم ان کو صرف اس لیے رد کر رہے ہو کہ کہیں تمہاری حیثیت، تمہاری مسندوں اور تمہاری چودھراہٹوں پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ یہ تو حقیر سی چیزیں ہیں۔ یہ صرف اس دنیا کا سامان ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔

﴿وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝﴾ "اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو۔" مجھ ہی سے بچتے رہو!

آیت ۴۲ ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

"اور نہ گڈمڈ کرو حق کے ساتھ باطل کو اور نہ چھپاؤ حق کو درانحالیکہ تم جانتے ہو۔"

یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ مغالطے میں غلط راہ پر پڑ جانا ضلالت اور گمراہی ہے،

لیکن جانتے بوجھتے حق کو پہچان کر اُسے ردّ کرنا اور باطل کی روش اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اسی سورۃ البقرۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ علماءِ یہود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اور قرآن کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۶) لیکن اس کے باوجود انہوں نے محض اپنی دُنیوی مصلحتوں کے پیشِ نظر آپ ﷺ اور قرآن کی تکذیب کی۔

آیت ۴۳ ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''
﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝﴾ ''اور جھکو (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ۔''
یعنی باجماعت نماز ادا کیا کرو۔

اوّل تو یہود نے رکوع کو اپنے ہاں سے خارج کر دیا تھا' ثانیاً باجماعت نماز ان کے ہاں ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہیں رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ گویا صراحت کی جا رہی ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ پر صرف ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی نہیں' بلکہ تمام اصول میں آپؐ کی پیروی ضروری ہے۔ نماز بھی آپؐ کے طریقے پر پڑھو جس میں رکوع بھی ہو اور جو باجماعت ہو۔

آیت ۴۴ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

ان آیات کے اصل مخاطب علماء یہود ہیں' جو لوگوں کو تقویٰ اور پارسائی کی تعلیم دیتے تھے لیکن ان کا اپنا کردار اس کے برعکس تھا۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور واعظین کا حال اکثر و بیشتر یہی ہے کہ اونچے سے اونچا وعظ کہیں گے' اعلیٰ سے اعلیٰ بات کہیں گے' لیکن ان کے اپنے کردار کو اُس بات سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی جس کی وہ لوگوں کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں۔ یہی درحقیقت علماءِ یہود کا کردار بن چکا تھا۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ ''حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔''

تم یہ کچھ کر رہے ہو اس حال میں کہ تم اللہ کی کتاب بھی پڑھتے ہو۔ یعنی تورات پڑھتے ہو' تم صاحبِ تورات ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سے علماء کا' جنہیں ہم علماءِ سوء کہتے ہیں' یہی حال ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

قرآن حکیم کے ترجمے میں‘ اس کے مفہوم میں‘ اس کی تفسیر میں بڑی بڑی تحریفیں موجود ہیں۔ الحمد للہ کہ اس کا متن بچا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ”کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟“

آیت ۴۵ ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ ”اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔“

یہاں پر صبر کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ علماءِ سوء کیوں وجود میں آتے ہیں؟ جب وہ صبر اور قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں تو حبِّ مال ان کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور وہ دنیا کے کُتّے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ دین کو بدنام کرنے والے ہوتے ہیں۔ بظاہر دینی مراسم کے پابند نظر آتے ہیں لیکن دراصل ان کے پردے میں دنیاداری کا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں صبر کی تاکید کی جارہی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں یہود کے علماء و مشائخ پر بایں الفاظ تنقید کی گئی ہے: ﴿لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾ (المائدۃ: ٦٣) ”کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے علماء اور صوفیاء جھوٹ بولنے سے اور حرام کھانے سے؟“ اگر کوئی عالم یا پیر اپنے ارادت مندوں کو ان چیزوں سے روکے گا تو پھر اس کو نذرانے تو نہیں ملیں گے‘ اس کی خدمتیں تو نہیں ہوں گی۔ چنانچہ اگر تو دنیا میں صبر اختیار کرنا ہے‘ تب تو آپ حق بات کہہ سکتے ہیں‘ اور اگر دُنیوی خواہشات (ambitions) مقدم ہیں تو پھر آپ کو کہیں نہ کہیں سمجھوتا (compromise) کرنا پڑے گا۔

صبر کے ساتھ جس دُوسری شے کی تاکید کی گئی وہ نماز ہے۔ علماء یہود وضوحِ حق کے باوجود جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاتے تھے اس کی بڑی وجہ حبِّ مال اور حبِّ جاہ تھی۔ یہاں دونوں کا علاج بتا دیا گیا کہ حبِّ مال کا مداوا صبر سے ہوگا‘ جبکہ نماز سے عبودیت و تذلل پیدا ہوگا اور حبِّ جاہ کا خاتمہ ہوگا۔

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ﴾ ”اور یقیناً یہ بہت بھاری شے ہے“

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اِنَّھَا کی ضمیر صرف صلوٰۃ کے لیے ہے۔ یعنی نماز بہت بھاری اور مشکل کام ہے۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ یہ درحقیقت اس پورے طرزِ عمل کی

طرف اشارہ ہے کہ دنیا کے شدائد اور ابتلاءات کا مقابلہ صبر اور نماز کی مدد سے کیا جائے۔ مطلوب طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے متعلقات میں کم سے کم پر قانع ہو جاؤ اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں آ جاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ نماز کو اپنے معمولاتِ حیات کا محور بناؤ' جو کہ عماد الدّین ہے۔ فرمایا کہ یہ روش یقیناً بہت بھاری ہے' اور نماز بھی بہت بھاری ہے۔

﴿اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ﴾ ''مگر اُن عاجزوں پر (بھاری نہیں ہے)۔''

اُن خشوع رکھنے والوں پر' اُن ڈرنے والوں پر یہ روش بھاری نہیں ہے جن کے دل اللہ کے آگے جھک گئے ہیں۔

آیت ۴۶ ﴿الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ''جنہیں یہ یقین ہے کہ وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں''

میں نے شروع میں ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴾ کے ذیل میں توجہ دلائی تھی کہ یہ ایمان بالآخرت ہی ہے جو انسان کو عمل کے میدان میں سیدھا رکھتا ہے۔

﴿وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ ''اور (جنہیں یہ یقین ہے کہ) بالآخر انہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' انہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۵۹

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ ؕ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک' بلکہ پندرھویں رکوع کی پہلی دو آیات بھی شامل کر لیجیے' یہ دس رکوعوں سے دو آیات زائد ہیں کہ جن میں خطاب کُل کا کُل بنی اسرائیل سے ہے۔ البتہ ان میں سے پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے' جس میں انہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دی گئی ہے' جبکہ بقیہ ۹ رکوع اُس فردِ قراردادِ جرم پر مشتمل ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کی جا رہی ہے کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ احسان و اکرام کیا' تم پر یہ فضل کیا' تم پر یہ کرم کیا' تمہیں یہ حیثیت دی' تمہیں یہ مقام دیا اور تم نے اس اس طور سے اپنے اس مشن کی خلاف ورزی کی جو تمہارے سپرد کیا گیا تھا اور اپنے مقام و مرتبہ کو چھوڑ کر دنیا پرستی کی روش اختیار کی۔ ان نو رکوعوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا تو ایک بہت بڑا حصہ اُس کے خدوخال (features) سمیت آ گیا ہے' لیکن اصل میں یہ اُمت مسلمہ کے لیے بھی ایک پیشگی تنبیہہ ہے کہ کوئی مسلمان اُمت جب بگڑتی ہے تو اُس میں یہ اور یہ خرابیاں آ جاتی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَاءِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))(۱)

''میری اُمت پر بھی وہ سب حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل ہوا ہے:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا :يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ : ((فَمَنْ؟))(۲)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے' بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

ترمذی کی مذکورہ بالا حدیث میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ: ((حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَّنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ)) یعنی اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا ہو گا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا تھا تو تم میں سے بھی کوئی شقی ایسا ضرور اٹھے گا جو یہ حرکت کرے گا۔ اس اعتبار سے اِن رکوعوں کو پڑھتے ہوئے یہ نہ سمجھئے کہ یہ محض اگلوں کی داستان ہے' بلکہ:

''خوشتراں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں''

کے مصداق یہ ہمارے لیے ایک آئینہ ہے اور ہمیں ہر مرحلے پر سوچنا ہو گا' دروں بینی کرنی ہو گی کہ کہیں اسی گمراہی میں ہم بھی تو مبتلا نہیں؟

دوسرا اہم نکتہ پہلے سے ہی یہ سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۴۷۔۴۸ جن سے اس چھٹے رکوع کا آغاز ہو رہا ہے' یہ دو آیتیں بعینہٖ پندرہویں رکوع کے آغاز میں پھر آئیں گی۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ وصحیح مسلم' کتاب العلم' باب اتباع سنن الیھود والنصاریٰ۔

ان میں سے پہلی آیت میں تو شوشے بھر کا فرق بھی نہیں ہے' جبکہ دوسری آیت میں صرف الفاظ کی ترتیب بدلی ہے' مضمون وہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ گویا دو بریکٹ ہیں اور نو (۹) رکوعوں کے مضامین ان دو بریکٹوں کے درمیان ہیں۔ اور سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع جو ان بریکٹوں سے باہر ہے' اس کے مضامین بریکٹوں کے اندر کے سارے مضامین سے ضرب کھا رہے ہیں۔ یہ حساب کا بہت ہی عام فہم سا قاعدہ ہے کہ بریکٹ کے باہر لکھی ہوئی رقم' جس کے بعد جمع یا تفریق وغیرہ کی کوئی علامت نہ ہو' وہ بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار (values) کے ساتھ ضرب کھائے گی۔ تو گویا اس پورے معاملے میں ہر ہر قدم پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت موجود ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اس حصے میں بعض آیات ایسی آ گئی ہیں جن سے کچھ لوگوں کو مغالطہ پیدا ہوا یا جن سے کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر فتنہ پیدا کیا کہ نجاتِ اُخروی کے لیے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان ضروری نہیں ہے۔ اس فتنے نے ایک بار اکبر کے زمانے میں ''دین الٰہی'' کی شکل میں جنم لیا تھا کہ آخرت میں نجات کے لیے صرف خدا کو مان لینا' آخرت کو مان لینا اور نیک اعمال کرنا کافی ہے' کسی رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ فتنہ صوفیاء میں بھی بہت بڑے پیمانے پر پھیلا اور ''مسجد مندر ہکو ونور'' کے فلسفے کی تشہیر کی گئی۔ یعنی مسجد میں اور مندر میں ایک ہی نور ہے' سب مذاہب اصل میں ایک ہی ہیں' سارا فرق شریعتوں کا اور عبادات کی ظاہری شکل کا ہے۔ اور وہ رسولوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ رسولوں کو بیچ میں سے نکال دیجیے تو یہ ''دینِ الٰہی'' (اللہ کا دین) رہ جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو ہندوستان میں اُس وقت اٹھا جب سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا اقتدار چوٹی (climax) پر تھا۔ یہ فتنہ جس مسلمان حکمران کا اٹھایا ہوا تھا وہ ''اکبر اعظم'' اور ''مغل اعظم'' کہلاتا تھا۔ اس کے پیش کردہ ''دین'' کا فلسفہ یہ تھا کہ دینِ محمدی ﷺ کا دَور ختم ہو گیا (نعوذ باللہ)' وہ ایک ہزار سال کے لیے تھا' اب دوسرا ہزار سال (الف ثانی) ہے اور اس کے لیے نیا دین ہے۔ اُسے ''دینِ اکبری'' بھی کہا گیا اور ''دینِ الٰہی'' بھی۔ سورۃ البقرۃ کے اس حصے میں ایک آیت آئے گی جس سے کچھ لوگوں نے اس ''دینِ الٰہی'' کے لیے استدلال کیا تھا۔

ہندوستان میں بیسویں صدی میں یہ فتنہ پھر اٹھا جب گاندھی جی نے ''متحدہ وطنی قومیت'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں میں سے ایک بہت بڑا نابغہ (genius) انسان ابوالکلام آزاد بھی اس فتنے کا شکار ہو گیا۔ گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں کچھ قرآن کی

تلاوت بھی کرواتے‘ کچھ گیتا بھی پڑھواتے‘ کچھ اُپنشدوں سے‘ کچھ بائبل سے اور کچھ گروگرنتھ سے بھی استفادہ کیا جاتا۔ متحدہ وطنی قومیت کا تصور یہ تھا کہ ایک وطن کے رہنے والے لوگ ایک قوم ہیں‘ لہٰذا ان سب کو ایک ہونا چاہیے‘ مذہب تو انفرادی معاملہ ہے‘ کوئی مسجد میں چلا جائے‘ کوئی مندر میں چلا جائے‘ کوئی گردوارے میں چلا جائے‘ کوئی کلیسا‘ سنیگاگ یا چرچ میں چلا جائے تو اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ اس طرح کے نظریات اور تصورات کا توڑ یہی ہے کہ یوں سمجھ لیجیے کہ پانچویں رکوع کی سات آیات بریکٹ کے باہر ہیں اور یہ بریکٹوں کے اندر کے مضمون سے مسلسل ضرب کھا رہی ہیں۔ چنانچہ ان بریکٹوں کے درمیان جتنا بھی مضمون آ رہا ہے وہ ان کے تابع ہوگا۔ گویا جہاں تک محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا معاملہ ہے وہ ہر مرحلے پر مقدر (understood) سمجھا جائے گا۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آیت ۴۷ ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ﴾ ’’اے یعقوب کی اولاد! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا‘‘

اس کی وضاحت گزشتہ رکوع میں ہو چکی ہے‘ لیکن یہاں آگے جو الفاظ آ رہے ہیں بہت زوردار ہیں:

﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾ ’’اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام جہانوں پر۔‘‘

عربی نحو کا یہ قاعدہ ہے کہ کہیں ظرف کا تذکرہ ہوتا ہے (یعنی جس میں کوئی شے ہے) لیکن اس سے مراد مظروف ہوتا ہے (یعنی ظرف کے اندر جو شے ہے)۔ یہاں بھی ظرف کی جمع لائی گئی ہے لیکن اس سے مظروف کی جمع مراد ہے۔ ’’تمام جہانوں پر فضیلت‘‘ سے مراد ’’جہان والوں پر فضیلت‘‘ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں تمام اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی۔ عالمِ انسانیت کے اندر جتنے بھی مختلف گروہ‘ نسلیں اور طبقات ہیں اُن میں فضیلت عطا کی۔

آیت ۴۸ ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا﴾ ’’اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی‘‘

قبل ازیں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ انسان نے عمل کے اعتبار سے سب سے مؤثر

شے ایمان بالآ خرۃ ہے۔ محاسبۂ آخرت اگر مستحضر رہے گا تو انسان سیدھا رہے گا' اور اگر اس میں ضعف آ جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت بھی نمعلوم کیا کیا شکلیں اختیار کر لیں۔ اس آیت کے اندر چار اعتبارات سے محاسبۂ اخروی پر زور دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی۔

﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ "اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی"

﴿وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ "اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا"

﴿وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾ "اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔"

ایمان بالآ خرۃ کے ضمن میں لوگوں نے طرح طرح کے عقیدے گھڑ رکھے ہیں' جن میں شفاعتِ باطلہ کا تصور بھی ہے۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے لات' منات اور عزیٰ وغیرہ کے نام سے اُن کے بُت بنا رکھے تھے' جنہیں وہ پوجتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی یہ لاڈلی بیٹیاں ہمیں اپنے "اباجان" سے چھڑا لیں گی۔ (**نعوذ باللّٰہ من ذٰلک**)۔ ہمارے ہاں بھی شفاعتِ باطلہ کا تصور موجود ہے کہ اولیاء اللہ ہمیں چھڑا لیں گے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بارے میں غلط تصورات موجود ہیں۔ ایک شفاعتِ حقہ ہے' جو برحق ہے' اس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں جب ہم آیت الکرسی کا مطالعہ کریں گے تو ان شاء اللہ اس کی وضاحت بھی ہو گی۔ یہ سارے تصورات اور خیالات جو ہم نے گھڑ رکھے ہیں' ان کی نفی اس آیت کے اندر دوٹوک انداز میں کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر جو احسانات و انعامات ہوئے اور ان کی طرف سے جو ناشکریاں ہوئیں ان کا تذکرہ بڑی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ واقعات کئی سو برس پر محیط ہیں اور ان کی تفصیل مکی سورتوں میں آ گئی ہے۔ ان واقعات کی سب سے زیادہ تفصیل سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ یہاں پر تو واقعات کا پے بہ پے تذکرہ کیا جا رہا ہے' جیسے کسی ملزم پر فردِ قراردادِ جرم عائد کی جاتی ہے تو اُس میں سب کچھ گنوایا جاتا ہے کہ تم نے یہ کیا' یہ کیا اور یہ کیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ "اور ذرا یاد کرو جب کہ ہم نے تمہیں نجات دی تھی فرعون کی قوم سے"

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ "وہ تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے"

﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ ؕ﴾ ''تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔''

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اُس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ ان سے خدمت لی جا سکے اور انہیں لونڈیاں بنایا جا سکے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ معاملہ دو مواقع پر ہوا ہے۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

﴿وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴾ ''اور اس میں تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے لیے بڑی آزمائش تھی۔''

آیت ۵۰ ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو (یا دریا کو) پھاڑ دیا''

یہ ایک مختلف فیہ بات ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا آنے کے لیے کس سمندر یا دریا کو عبور کیا تھا۔ ایک رائے یہ ہے کہ دریائے نیل کو عبور کر کے گئے تھے' لیکن یہ بات اس اعتبار سے غلط ہے کہ دریائے نیل تو مصر کے اندر بہتا ہے' وہ کبھی بھی مصر کی حد نہیں بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ بحیرۂ قلزم (Red Sea) اوپر جا کر دو کھاڑیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے' مشرق کی طرف خلیج عقبہ اور مغرب کی طرف خلیج سویز ہے اور ان کے درمیان جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninsula) ہے۔ یہ اسی طرح کی تکون ہے جیسے جزیرہ نمائے ہند (Indian Peninsula) ہے۔ خلیج سویز اور بحیرۂ روم کے درمیان کئی بڑی بڑی جھیلیں تھیں' جن کو باہم جوڑ جوڑ کر' درمیان میں حائل خشکی کو کاٹ کر نہر سویز بنائی گئی ہے' جو اَب ایک مسلسل رابطہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ مجھے خود بھی اسی رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ کوہِ طور اس جزیرہ نمائے سینا کی نوک (tip) پر واقع ہے' جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن رات کے لیے بلایا گیا اور پھر انہیں تورات دی گئی۔ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو اس طرح عبور کیا کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی ایک ضرب سے سمندر پھٹ گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:
﴿فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴾ (الشُّعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا ہر حصہ جیسے بڑا پہاڑ''۔ سمندر کا پانی دونوں طرف پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اور بنی اسرائیل

اس کے درمیان میں سے نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جب فرعون اپنا لشکر لے کر آیا تو اُس نے سوچا کہ ہم بھی ایسے ہی نکل جائیں گے‘ لیکن وہ غرق ہو گئے۔ اس لیے کہ دونوں طرف کا پانی آپس میں مل گیا۔ یہ ایک معجزانہ کیفیت تھی اور یہ بات فطرت (nature) کے قوانین کے مطابق نہیں تھی۔

﴿فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ ''پھر تمہیں تو نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔''

تمہاری نگاہوں کے سامنے فرعون کے لاؤلشکر کو غرق کر دیا۔ بنی اسرائیل خلیج سویز سے گزر چکے تھے اور دوسری جانب کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اِدھر سے فرعون اور اس کا لاؤلشکر سمندر میں داخل ہوا تو پانی دونوں طرف سے آ کر مل گیا اور یہ سب غرق ہو گئے۔

آیت ۵۱ ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰؑ سے چالیس رات کا''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے چالیس دن رات کے لیے کوہِ طور پر بلایا۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ''پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو (معبود) اُس کے بعد''

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی اور اسے معبود بنا لیا۔

﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ ''اور تم ظالم تھے۔''

بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا تھا۔ الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ کے مصداق عظیم ترین ظلم جو ہے وہ شرک ہے‘ اور بنی اسرائیل نے شرکِ جلی کی یہ مکروہ ترین شکل اختیار کی کہ بچھڑے کی پرستش شروع کر دی!

آیت ۵۲ ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ '' پھر ہم نے تمہیں اس کے بعد بھی معاف کیا'' ——— یہ ہمارا اکرم رہا ہے‘ ہماری رحمت رہی ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ''تا کہ تم شکر کرو۔''

آیت ۵۳ ﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان عطا فرمائی تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

''فرقان'' سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کر دینے والی چیز ہے اور کتاب کا لفظ عام طور پر شریعت کے لیے آتا ہے۔

آیت ۵۴ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ کہا تھا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے''

﴿يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! یقیناً تم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے بچھڑے کو معبود بنا کر''

﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ ''پس اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی جناب میں''

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط﴾ ''تو قتل کرو اپنے آپ کو۔''

یہ واقعہ تورات میں تفصیل سے آیا ہے' قرآن میں اس کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ بہت سے واقعات جن کا قرآن میں اجمالاً ذکر ہے ان کی تفصیل کے لیے ہمیں تورات سے رجوع کرنا پڑتا ہے' ورنہ بعض آیات کا صحیح صحیح مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط﴾ ''مار ڈالو اپنی جانیں'' یا ''قتل کرو اپنے آپ کو''۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ دراصل قتل مرتد کی سزا ہے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگوں نے یہ کفر اور شرک کیا کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا' باقی لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ہر قبیلے کے وہ لوگ جو اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو قتل کریں جو اس کفر و شرک کے مرتکب ہوئے۔ ''فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرو۔ اس لیے کہ قبائلی زندگی بڑی حساس ہوتی ہے اور کسی دوسرے قبیلے کی مداخلت سے قبائلی عصبیت بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم پر عمل درآمد کے نتیجے میں ستر ہزار یہودی قتل ہوئے۔ اس سے بڑی توبہ اور اس سے بڑی تطہیر (purge) ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی نظریاتی جماعت کے اندر تزکیہ اور تطہیر کا عمل بہت ضروری ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایک نظریے کو قبول کر کے جماعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں' لیکن رفتہ رفتہ نظریہ اوجھل ہو جاتا ہے اور اپنے مفادات اور چودھراہٹیں مقدم ہو جاتی ہیں۔ اسی سے جماعتیں خراب ہوتی ہیں اور غلط راستے پر پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ نظریاتی جماعتوں میں یہ عمل بہت ضروری ہوتا ہے کہ جو افراد نظریے سے منحرف ہو جائیں ان کو

جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے۔

قرآن حکیم کے اس مقام سے قتلِ مرتد کی سزا ثابت ہوتی ہے' جبکہ قتلِ مرتد کا واضح حکم حدیث نبویؐ میں موجود ہے۔ ہمارے بعض جدید دانشورِ اسلام میں قتل مرتد کی حد کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن میرے نزدیک یہ شریعتِ موسویؑ کا تسلسل ہے۔ شریعت موسویؑ کے جن احکام کے بارے میں صراحتاً یہ معلوم نہیں کہ انہیں تبدیل کر دیا گیا ہے وہ شریعت محمدی ﷺ کا جزو بن گئے ہیں۔ شادی شدہ زانی پر حدِّ رجم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن مجید میں حدِّ رجم کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن احادیث میں یہ سزا موجود ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں مرتد کے قتل کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن یہ حدیث اور سنت سے ثابت ہے۔ البتہ ان دونوں سزاؤں کا منبع اور ماخذ دراصل تورات ہے۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کا یہ مقام بہت اہم ہے' لیکن اکثر لوگ یہاں سے بہت سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ جزیرہ نمائے سینا پہنچنے کے بعد ان کی تعداد مزید بڑھ گئی ہو گی۔ اُن میں سے ستر ہزار افراد کو شرک کی پاداش میں قتل کیا گیا' اور ہر قبیلے نے جو اپنے مرتد تھے ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ﴾ ''یہی تمہارے لیے تمہارے ربّ کے نزدیک بہتر بات ہے۔''

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ﴾ ''تو (اللہ نے) تمہاری توبہ قبول کر لی۔''

بنی اسرائیل کی توبہ اس طرح قبول ہوئی کہ اُمت کا تزکیہ ہوا اور ان میں سے جن لوگوں نے اتنی بڑی غلط حرکت کی تھی ان کو ذبح کر کے' قتل کر کے اُمت سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ ''یقیناً وہ تو ہے ہی توبہ کا بہت قبول فرمانے والا' بہت رحم فرمانے والا۔''

آیت ۵۵ ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ''اور یاد کرو جبکہ تم نے کہا تھا اے موسیٰؑ! ہم تمہارا ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں''

اٰمَنَ يُؤْمِنُ کے بعد ''بِ'' کا صلہ ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں' جبکہ ''لِ'' کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی صرف تصدیق کے ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے جب تک ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو آپ سے کلام کرتے نہ دیکھ لیں۔ ہم کیسے یقین کر لیں کہ اللہ نے یہ کتاب آپ کو دی ہے؟ آپ تو ہمارے سامنے پتھر کی کچھ تختیاں لے کر آ گئے ہیں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ ہمیں کیا پتا کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ دیکھئے ایک خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تھی کہ ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ؕ﴾ (الاعراف:۱۴۳) ''اے میرے ربّ! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھ کو دیکھوں''۔ وہ کچھ اور شے تھی' وہ ع ''تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ!'' کی کیفیت تھی' لیکن یہ تخریبی ذہن کی سوچ ہے کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اُس نے آپ کو یہ کتاب دی ہے۔

﴿فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''تو تمہیں آ پکڑا ایک بہت بڑی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔'' تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑی کڑک نے تمہیں آ لیا اور تم سب کے سب مردہ ہو گئے۔

آیت ۵۶ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ﴾ ''پھر ہم نے تمہیں دوبارہ اٹھایا تمہاری موت کے بعد''

بعض لوگ اس کی ایک تاویل کرتے ہیں کہ یہ موت نہیں تھی' بلکہ زبردست کڑک کی وجہ سے سب کے سب بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے' لیکن میرے نزدیک یہاں تاویل کی ضرورت نہیں ہے' بعث بعد الموت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ﴾ کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صریح ہیں' انہیں خواہ مخواہ کوئی اور معنی پہنانا درست نہیں ہے۔

﴿لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''تا کہ تم (اس احسان پر ہمارا) شکر کرو۔''

آیت ۵۷ ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ﴾ ''اور ہم نے تم پر اَبر کا سایہ کیا''

جزیرہ نمائے سینا کے لق و دق صحرا میں چھ لاکھ کا قافلہ چل رہا ہے' کوئی اوٹ نہیں' کوئی سایہ نہیں' دھوپ کی تپش سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں۔ ان حالات میں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ تمام دن ایک بادل ان پر سایہ کیے رہتا اور جہاں جہاں وہ جاتے وہ بادل ان کے ساتھ ساتھ ہوتا۔

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ؕ﴾ ''اور اتارا تم پر مَنّ اور سلویٰ۔''

صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا تو ان کے لیے مَنّ و سلویٰ

نازل کیے گئے۔ ''مَنّ'' رات کے وقت شبنم کے قطروں کی مانند اترتا تھا' جس میں شیرینی بھی ہوتی تھی' اور اس کے قطرے زمین پر آ کر جم جاتے تھے اور دانوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یہ گویا ان کا اناج ہو گیا' جس سے کاربوہائیڈریٹس کی ضرورت پوری ہو گئی۔ ''سلویٰ'' ایک خاص قسم کا بٹیر کی شکل کا پرندہ تھا۔ شام کے وقت ان پرندوں کے بڑے بڑے جھنڈ آتے اور جہاں بنی اسرائیل ڈیرہ ڈالے ہوتے اس کے گرد اتر آتے تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ اُن پرندوں کو آسانی سے پکڑ لیتے تھے اور بھون کر کھاتے تھے۔ چنانچہ اُن کی پروٹین کی ضرورت بھی پوری ہو رہی تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو مکمل غذا فراہم کر دی تھی۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾ ''(ہم نے کہا) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں کو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں۔''

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ ''اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا' بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے۔''

ہر قدم پر نافرمانی اور ناشکری بنی اسرائیل کا وطیرہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے ''مَنّ و سلویٰ'' جیسی نعمت کی قدر بھی نہ کی اور ناشکری کی روش اپنائے رکھی۔ اس کا ذکر اگلی آیات میں آ جائے گا۔

آیت ۵۸ ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور پھر کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو جو چاہو''

﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ﴾ ''لیکن دیکھنا (بستی کے) دروازے میں داخل ہونا جھک کر اور کہتے رہنا مغفرت مغفرت' تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائیں گے۔''

﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ''اور محسنین کو ہم مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔''

بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں آنے اور تورات عطا کیے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے میں انہیں جہاد اور قتال کا حکم ہوا' لیکن اس سے پوری قوم نے انکار کر

دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ سزا مسلط کر دی کہ یہ چالیس برس تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ ابھی جہاد اور قتال کرتے تو ہم پورا فلسطین ان کے ہاتھ سے ابھی فتح کرا دیتے‘ لیکن چونکہ انہوں نے بزدلی دکھائی ہے لہٰذا اب ان کی سزا یہ ہے کہ: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ﴾ (المائدۃ:۲٦) یعنی ارضِ فلسطین جو ان کے لیے ارضِ موعود تھی وہ ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے‘ اب یہ چالیس سال تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ صحرانوردی کے اس عرصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی۔ اس عرصے میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی اور وہ نسل جو مصر سے غلامی کا داغ اٹھائے ہوئے آئی تھی وہ پوری کی پوری ختم ہو گئی۔ غلامی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ غلام قوم کے اندر اخلاق و کردار کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صحرا نوردی کے زمانے میں جو نسل پیدا ہوئی اور صحرا ہی میں پروان چڑھی وہ ایک آزاد نسل تھی جو ان کمزوریوں سے پاک تھی اور ان میں ایک جذبہ تھا۔ بنی اسرائیل کی اس نئی نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع بن نون [تورات میں ان کا نام یشوع (Joshua) آیا ہے] کی قیادت میں قتال کیا اور پہلا شہر جو فتح ہوا وہ ''اریحا'' تھا۔ یہ شہر آج بھی جریکو (Jericho) کے نام سے موجود ہے۔

یہاں پر اس فتح کے بعد کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو جاؤ اور پھر جو کچھ نعمتیں یہاں ہیں ان سے متمتع ہو‘ خوب کھاؤ پیو‘ لیکن شہر کے دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مراد یہ ہے کہ جھک کر‘ سجدۂ شکر بجا لاتے ہوئے داخل ہونا۔ ایسا نہ ہو کہ تکبر کی وجہ سے تمہاری گردنیں اکڑ جائیں۔ اللہ کا احسان مانتے ہوئے گردنیں جھکا کر داخل ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ فتح تم نے بزورِ بازو حاصل کی ہے۔ اس کا نقشہ ہمیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں نظر آتا ہے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر آپ مکہ میں داخل ہوئے تو جس سواری پر آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے آپ کی پیشانی مبارک اس کی گردن کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ یہ وقت ہوتا ہے جبکہ ایک فاتح تکبر اور تعلّی کا مظاہرہ کرتا ہے‘ لیکن بندۂ مؤمن کے لیے یہی وقت تواضع کا اور جھکنے کا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں حکم دیا گیا کہ: ﴿وَقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ﴾ ''اور کہتے جاؤ مغفرت مغفرت''۔ حِطَّةٌ کا وزن فِعۡلَةٌ اور مادہ ''ح ط ط'' ہے۔ حَطَّ يَحُطُّ حَطًّا کے متعدد معنی ہیں‘ جن میں سے ایک ''پتے جھاڑنا'' ہے۔ مثلاً کہیں گے حَطَّ وَرَقَ الشَّجَرِ (اُس نے

درخت کے پتے جھاڑ دیے) حِطَّةٌ کے معنی ''استغفار' طلب مغفرت اور توبہ'' کے کیے جاتے ہیں۔ گویا اس میں گناہوں کو جھاڑ دینے اور خطاؤں کو معاف کر دینے کا مفہوم ہے۔ چنانچہ ''وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ مفتوح بستی میں داخل ہوتے وقت جہاں تمہاری گردنیں عاجزی کے ساتھ جھکی ہوئی چاہئیں وہیں تمہاری زبان پر بھی استغفار ہونا چاہیے کہ اے اللہ ہمارے گناہ جھاڑ دے' ہماری مغفرت فرما دے' ہماری خطاؤں کو بخش دے! اگر تم ہمارے اس حکم پر عمل کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے' اور تم میں جو محسن اور نیکوکار ہوں گے انہیں مزید فضل و کرم اور انعام و اکرام سے نوازیں گے۔

آیت ۵۹ ﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ﴾ ''پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے جو اُن سے کہہ دی گئی تھی''

ان میں سے جو ظالم تھے' بدکردار تھے انہوں نے ایک اور قول اختیار کر لیا اُس قول کی جگہ جو اُن سے کہا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ''حِطَّةٌ حِطَّةٌ'' کہتے ہوئے داخل ہونا' لیکن انہوں نے اس کی بجائے ''حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ'' کہنا شروع کر دیا' یعنی ہمیں تو گیہوں چاہیے' گیہوں چاہیے! اگلے رکوع میں یہ بات آ جائے گی کہ مَن و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کی طبیعتیں بھر گئی تھیں' ایک ہی چیز کھا کھا کر وہ اکتا گئے تھے اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں زمین کی روئیدگی اور پیداوار میں سے کوئی چیز کھانے کو ملنی چاہیے۔ اس خواہش کا اظہار اُن کی زبانوں پر ''حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ'' کی صورت میں آ گیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا استہزاء و تمسخر کیا جو انہیں ''وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ'' کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔ اسی طرح شہر میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے انہوں نے اپنے سرینوں پر پھسلنا شروع کیا۔

﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ''پھر ہم نے اتارا ظلم کرنے والوں پر ایک بڑا عذاب آسمان سے''

جن ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا استہزاء و تمسخر کیا تھا اُن پر آسمان سے ایک بہت بڑا عذاب نازل ہوا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اریحا شہر میں پہنچنے کے بعد انہیں طاعون کی وبا نے آ لیا اور جنہوں نے یہ حرکت کی تھی وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

﴿بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ''بسبب اُس نافرمانی کے جو انہوں نے کی۔''

یہ اُن نافرمانیوں اور حکم عدولیوں کی سزا تھی جو وہ کر رہے تھے۔